

Article:

فلسطین کے تناظر میں ناول the Scar of David کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

Authors &

¹ Dr. Maria Termezi

Teaching research associate, international Islamic university
Islamabad.

Affiliations:

² Dr. Shiraz fazal Dad

Assistant professor, international Islamic university Islamabad.

Email Add:

¹ maria.termezi@iiu.edu.pk

² shiraz.fazal@iiu.edu.pk

ORCID ID:

¹ <https://orcid.org/0009-0003-0682-8220>

Published:

2024-01-11

Article DOI:

<https://doi.org/10.5281/zenodo.10680822>

Citation:

Maria Termezi, and Dr. Shiraz fazal Dad. 2024. "فلسطین کے تناظر میں ناول the Scar of David کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ: Critical and Analytical Study of the Novel the Scar of David in the Context of Palestine". AL MISBAH RESEARCH JOURNAL 4 (01):16-25.
<https://reinci.com/ojs3308/index.php/almisbah/article/view/218>.

Copyright's info:

Copyright (c) 2023 AL MISBAH RESEARCH JOURNAL



This work is licensed under a [Creative Commons Attribution 4.0 International License](https://creativecommons.org/licenses/by/4.0/).

Published By:

Research Institute of Culture and Ideology,
Islamabad.

Indexation's



EuroPub



REINCI

فلسطین کے تناظر میں ناول *the Scar of David* کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

Critical and analytical study of the novel the Scar of David in the context of Palestine

* Dr.Maria Termezi

** Dr. Shiraz fazal Dad

Abstract

Susan abulhawa is a American writer. The scar of David is her first novel published in 2006. It's a historical novel which discusses the Palestine and Israel conflict. Mainly In novel there is a Palestinian family from the village of Ein Hod, which was emptied of its inhabitants by the newly formed State of Israel in 1948. Most of novel, is narrated by Amal through her reader get the stories of brothers, one of them kidnapped by an Israeli soldier and raised Jewish, the other who sacrifices everything for the cause of Palestine. Novel discusses the heart-breaking story of a Palestinian family which narrates about love, friendship, identity crisis, patriotism, terrorism, courage and hope. Novel shares many historical events which occurs between 1948 to 2002. it also discuss the role of political leaders and UNO, Silent presence of Arab countries in Palestine issue. Novelist tries to show the psychological problems and personality crisis of children's due to war. This historical novel forces reader to take a fresh look at one of the defining political conflicts of time. It is deeply a human novel the novelist remains objective till the end. Novel presented the Palestine issue on the basis of humanity.

Key Words: historical fiction, Palestine, Israel, jenin, America, humanity, genocide, bloodshed, acrimony.

سوزن ابو الہوا امریکی مصنفہ ہیں جن کا تعلق فلسطین سے ہے۔ ان کا خاندان ۱۹۶۷ء کی فلسطین اسرائیل جنگ میں گھر سے بے گھر ہونے پر مجبور ہوا۔ مصنفہ نے بھی اپنا بچپن اور لڑکپن شہر بدلتے ہوئے گزارا۔ تعلیم کی غرض سے امریکہ منتقل ہوئیں۔ بعد ازاں یونیورسٹی آف ساوتھ کیرولینا سے بائیو میڈیکل سائنسز میں گریجویشن کیا۔ عملی زندگی کا آغاز بھی اسی شعبے سے کیا مگر ان کی اصل وجہ شہرت ان کی تحریریں ہیں۔ خصوصاً ان کا زیر بحث ناول *The Scar of David* ان کی وجہ شہرت ہے۔ اس ناول کی تحریر کا محرک ان کا ۲۰۰۲ء میں کیا جانے والا فلسطین کا دورہ تھا۔ ۲۰۰۲ء میں جنین کے علاقے میں آباد پناہ گزینوں کا دہشت گردوں کے صفائے کے نام پر قتل عام کیا گیا۔ مصنفہ نے اپنے اس سفر میں وہاں اسرائیل کی بربریت کے مظاہرے اور پناہ گزینوں کی بنیادی انسانی حقوق سے محروم زندگی کو دیکھا۔ حساس ادیبہ نے جنین کے پناہ گزینوں کی بے زبان کہانی کو اپنے قلم کی بدولت زبان دینے کی تحریک یہیں سے حاصل کی۔ فلسطینیوں کے دکھ درد کو سمجھتے ہوئے انھوں نے عملی سطح پر بھی کچھ اقدامات اٹھائے۔ ایک نجی فلاحی ادارہ ”Play ground for Palestine“ قائم کیا جس کا مقصد مقبوضہ علاقے میں رہنے والے بچوں کے لیے کھیل کے میدان کرنا تھا۔ جس کے تحت اب تک فلسطین کے بچوں کے لیے مختلف علاقوں میں کھیل کے میدان قائم کیے گئے ہیں۔ جیسے کے جنین میں ”Freedom Theater“ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس کا مقصد ۴ سے ۱۲ سال تک کے عمر کے بچوں کی تخلیقی صلاحیتوں کی افزائش کرنا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف علاقوں جیسے کہ بیت عنان، قلقیلیہ، السموع، رفح، سلواد میں بھی بچوں کے لیے کھیل کے میدان قائم کیے

* Teaching research associate, international Islamic university Islamabad.

** Assistant professor, international Islamic university Islamabad.

فلسطین کے تناظر میں ناول *the Scar of David* کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

گئے ہیں۔ اس رفاچی منصوبے کے تین بنیادی اصول مقرر کیے گئے۔ ۱۔ کھیل کے میدان بچے اور بچیاں مساوی استعمال کریں گے۔ ۲۔ کھیل کا میدان اور وہاں موجود تمام جھولوں کے استعمال کے عوض بچوں سے کوئی معاوضہ نہیں لیا جائے گا۔ ۳۔ کھیل کے میدانوں کی نگہداشت کی ذمہ داری مقامی انتظامیہ کی ہوگی۔ ۴۔ مصنفہ BDS کی تحریک کا متحرک رکن بھی ہے۔ جس کا مقصد اسرائیل کے ظالمانہ رویے کے خلاف احتجاج کرنا تھا اور فلسطین کے حق میں آواز بلند کرنا تھا۔ امریکا کے مختلف صحافتی اداروں سے بھی وابستہ رہیں۔ ۳

The scar of david کے نام سے ان کا پہلا ناول ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا۔ اس تاریخی ناول کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس کی تمام کاپیاں فروخت ہو گئیں۔ تراجم کے توسط سے دوسری زبانوں میں منتقل ہوا تو فرانسیسی زبان میں خاص مقبولیت کا حامل ٹھہرا۔ فرانسیسی میں یہ سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب کی حیثیت اختیار کر گیا۔ ۲۰۱۰ء میں امریکہ کے بلومبری پبلشرز نے اسے *Mornings in Jenin* کے عنوان سے دوبارہ شائع کیا۔ ۴ ناول کا یہی نام اب عام جانا جاتا ہے۔ اس ناول کا دنیا کی کم و بیش بتیس زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ اردو میں مسعود اشعر نے زخم کا نشان کے عنوان سے اس کا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ۲۰۱۰ء میں شہر زاد پبلشرز سے شائع ہوا۔ ۵ اس ناول کی تخلیق کا ایک محرک مصنفہ کو پیدا ہونے والا یہ احساس بھی تھا کہ تخلیقی ادب میں فلسطین کا بیانیہ بہت حد تک مفقود ہے۔ اس احساس کو جگانے کا کام ایڈورڈ سعید نے کیا۔

اس تاریخی ناول کا کینوس وسیع ہے۔ ناول کی کہانی تقریباً اسرائیل اور فلسطین کے تنازعے کے ساٹھ سالوں پر مشتمل ہے۔ یوں چار نسلوں کے دکھ اس میں پردے گئے ہیں۔ ناقدین و قارئین تاریخی فکشن کے حوالے سے اسے افغانستان کی جنگ کے تناظر میں لکھے جانے والے ناول *Kite Runner* کے مقابل کھڑا کرتے ہیں۔ ۶ جس طرح تخلیقیت کا ثبوت دیتے ہوئے خالد حسینی نے افغانستان کی نسل پر جنگ کے اثرات کا جائزہ لیا ہے اسی طرح *The scar of david* میں مصنفہ نے حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے فلسطین کی روح و جسم پر لگے زخموں سے گھائل نسلوں کی روداد کو زبان دی ہے۔ ناول نگار نے فلسطین کی لہو لہو داستان مختلف زاویہ نظر سے سنائی ہے مگر بحیثیت مجموعی بیکی ابوالحجہ کے خاندان کی زبانی پیش کی ہے۔ ناول کی کہانی کا آغاز ۱۹۴۸ء کی فلسطینیوں کی اپنے آبائی گھروں سے بے دخلی سے قبل پر سکون زندگیوں سے ہوتا ہے۔ عین ہود کے قدیم گاؤں کے کسانوں کی توانائی سے بھرپور زندگیاں دکھائی گئی ہیں کہ وہ فصل اکٹھی کرنے میں اور زیتون سمیت دیگر اجناس کی حفاظت میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ حب الوطنی اور مٹی سے لگاؤ ان کے انگ انگ سے جھلکتا نظر آتا ہے۔ اسرائیل کی پیش قدمی کی خبریں انھیں محض خواب سی محسوس ہوتی ہے۔ ۱۹۴۸ء کا سال ان کی زندگیوں میں تلاطم لے کر آتا ہے نئی قائم ہونے والی ریاست اسرائیل انھیں جبراً ان کے قدیم گاؤں اور آبائی گھروں سے بے دخل کر دیتی ہے اور یوں فلسطینی کسان جنین کے پناہ گزینوں میں بدل جاتے ہیں جہاں وہ ہر دن کھلی آنکھوں سے اپنے گھروں کو لوٹ جانے کے خواب دیکھتے ہیں۔

مرکزی کہانی بیکی ابوالحجہ کے خاندان کی ہے۔ جو اس کی بیوی باسمہ اور دو بیٹوں حسن اور درویش پر مشتمل ہے۔ ضالیہ حسن کی بیوی بن کر اس کا خاندان حصہ بنتی ہے۔ ان کے تین بچے ہیں یوسف، اسمعیل اور امل۔ امل کی پیدائش جنین کے پناہ گزین کیمپ میں ہوئی۔ کہانی کے بیشتر حصے کی راوی امل ہے۔ پہلی دونوں نسلیں خود کو ۱۹۴۸ء کی جنگ کے اثرات سے آزاد نہیں کروا پاتی۔ باسمہ فلسطین کی تباہی کے آغاز میں جان دے دیتی ہے۔ درویش جسے گھڑ سواری کا بے حد شوق تھا، گھوڑے کی تنگی پیڑھ پر ہوا کی رفتار سے چلنا اس کی عادت تھی گولی لگنے سے اپانچ ہو جاتا ہے۔ جنین کے کیمپ میں بیکی کو زیتون سمیت دیگر پھلوں کی خوشبو اضطراب کا شکار کرتی۔ وہ تصور میں فصل کے پکنے اور کٹنے کا منتظر رہتا۔ وہ اس امید پر کچھ عرصہ کیمپ میں رہتا ہے کہ جلد ہی واپس اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے مگر جیسے جیسے اس کی امید دم توڑنے لگتی ہے وہ اپنی مٹی کی محبت میں بے چین رہنے لگتا ہے اور چھپ کر اپنی زمین کی طرف جاتا نتیجتاً مارا جاتا ہے۔ بیکی کا کردار زمین پیوستگی اور حب الوطنی کی علامت ہے۔ ناول نگار

نے اپنی زمین پر مارے جانے کی مسرت کا اظہار اس کی مسکراتی ہوئی لاش سے کیا ہے اور موت کا سبب دل ٹوٹنا بتایا ہے۔ حسن اور ضالیہ عین ہود سے بے دخلی کی افراتفری میں اسمعیل کے کھوجانے کا غم لیے جنین میں پناہ لیتے ہیں۔ حسن اقوام متحدہ کو خط لکھنے کے ساتھ ساتھ یہاں بچوں کی تعلیم کے لیے سکول قائم کرواتا ہے اہل کی صورت میں زندگی جینے کی سعی کرتے ہیں مگر پھر ۱۹۶۷ء کی جنگ واقع ہو جاتی ہے۔ جس میں ضالیہ اپنے مکمل حواس کھودیتی ہے اور حسن لاپتہ ہو جاتا ہے۔ یوں دوسری نسل بھی آزادی کی جنگ میں زندگیاں ہارتی دکھائی گئی ہے۔ یوسف جسمانی تشدد، انا کے ٹوٹنے، اسمعیل کے یہودی بن جانے کے غم کے ساتھ ایک فدائی بن جاتی ہے۔ اہل اس جنگ میں سب رشتوں کو کھودینے کے بعد یروشلم کے یتیم خانے پہنچ جاتی ہے۔ جہاں سے وظیفہ پر امریکہ تعلیم کے لیے چلی جاتی ہے۔

ناول کا پلاٹ کہانی کا جز ہوتا ہے مگر فنی نقطہ نظر سے اپنی الگ حیثیت رکھتا ہے۔ پلاٹ درحقیقت کہانی یا قصے کی تزئین و آرائش کا نام ہے۔ کہانی میں جو کچھ کہنا مقصود ہے وہ کس ڈھنگ سے کہا جائے گا یہ پلاٹ طے کرتا ہے۔ اس ناول کا کیونس بہت وسیع ہے۔ ۱۹۴۸ء سے ۲۰۰۲ء تک کے تاریخی واقعات کو فکشن میں پیش کرنے کے لیے مصنفہ پلاٹ پر خصوصی محنت کی ہے۔ مرکزی کردار اہل کی زندگی کو مرکزی نقطہ بناتے دیگر کرداروں کو مسخ نہیں ہونے دیا۔ اہل کے کردار کو ایک ڈوری کی صورت پیش کیا ہے جو تمام کرداروں کو لڑی میں پرونے کا کام سرانجام دیتی ہے۔ مختلف کرداروں کے متنوع قصوں کو فلسطین پر غاصبانہ قبضے کے ایک مرکزی قصے کے ساتھ پلاٹ میں باہم مربوط کر دیا گیا ہے۔

ناول کا عنوان *The scar of david* حسن اور ضالیہ کے اپنے گھر سے بے سرو سامانی میں نکالے گئے روز بھگدڑ میں اغوا ہو جانے والے چھ ماہ کے بچے اسمعیل کے چہرے پر موجود نشان تھا۔ جسے ایک بے اولاد یہودی فوجی نے اغوا کر لیا تھا اور ڈیوڈ نام سے اس کی پرورش ایک یہودی کے طور پر کی تھی۔ بچھڑنے سے قبل پنکوڑے کی ایک کیل لگ جانے کے باعث اس کی آنکھ کے نیچے ایک چوٹ لگ گئی تھی۔ اسی زخم کا نشان تمام عمر اس کے چہرے پر رہا۔ ناول کا عنوان فقط چہرے پر چوٹ کے نشان کا اظہار نہیں ہے بلکہ یہ زخم اسمعیل کے ڈیوڈ میں تبدیل ہو جانے کا ہے۔ عدم شناخت کے لیے کا ہے۔ اپنے جیسے نظر آنے والے فلسطینی سگے بھائی یوسف کو جذباتی ہیجان کے باعث شدت سے پیٹنے پر اپنی گھاسل ہونے والی روح پر لگے تاحیات نشان کی علامت بھی ہے۔ اصلیت معلوم ہونے پر یہودی بیوی کے الگ ہو جانے سے دل پر لگنے والی چوٹ کا نشان بھی ہے۔ یہ ضالیہ کی دکھی منہ کی چوٹ کا اظہار بھی ہے۔ اس سے بھی آگے اسمعیل جن کو والدین سمجھ کے پیار کرنا ہاں ان سے ملنے والے فریب کی چوٹ بھی ہے۔ سالوں بعد اہل کو ملنے پر وہ یہودی ماں یولانتا کی محبت کی ذکر کے ساتھ کہتا ہے ”محبت فریب کے زخم تو نہیں بھر سکتی۔“

یہ فریب فقط اسمعیل کو ملنے والا فریب نہیں ہے۔ بلکہ پوری فلسطینی قوم کے ساتھ ہونے والے فریب کا زخم ہے۔ یہودیوں کا فلسطین کی سرزمین میں پناہ گزینوں کی صورت میں داخل ہونا اور یہاں ملکیت کا دعویٰ کرنا ایک فریب ہی تو تھا۔

یورپ سے جو لوگ وہاں گئے وہ ”ہمس“ کو جانتے تھے نہ ”فلافل“ کو مگر بعد میں ان پر اپنا دعویٰ کر دیا اور انھیں اسرائیلی کھانے کھانے لگا۔ انھوں نے قطمون کے محلات کو قدیم یہودی گھر قرار دیا حالانکہ وہ خواہ کتنی ہی کو شش کر لیں محراب دار چھتوں، زینوں، کھڑکیوں اور دروازوں کے عرب فن تعمیر کی ذرا سی بھی نقل نہیں کر سکتے۔ ان کے پاس اپنے بزرگوں کی پرانی ڈرائنگ، یا تصویریں بھی نہیں ہیں جو کبھی وہاں رہتے تھے، اس سرزمین سے محبت کرتے تھے اور وہاں کھیتی باڑی کرتے تھے۔ وہ غیر ملکوں اور غیر قوموں سے وہاں آئے اور فلسطین کی زمین میں کھدائی کر کے کنعانی، رومن اور عثمانی دور کے سکے نکالے اور ان پر قدیم اسرائیلی آثار کا دعویٰ کر دیا۔ وہ

فلسطین کے تناظر میں ناول *the Scar of David* کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

جافہ آئے اور وہاں خربوزے برابر نارنگیاں دیکھیں اور بولے ”دیکھو دیکھو یہودی اپنی ان کی نارنگیوں کے لیے مشہور ہیں لیکن وہ نارنگیاں ان فلسطینی باغبانوں کی محنت کا ثمر ہیں جنہوں نے صدیوں کے تجربے سے ترش پھلوں کی پیداوار کے فن میں پختگی حاصل کی تھی۔“^۸

ناول کے کرداروں کو سامنے رکھا جائے تو اس امر کا بھی باخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ زخم کا نشان فقط اسمعیل کی جسم و روح پر نہیں ہے بلکہ دیگر کرداروں کی روحیں اور جسم بھی نشان زدہ ہے۔ مرکزی کردار امل بھی جسم و روح پر بہت سے زخم لیے ہوئے ہے۔ جنین کے کیمپ میں اسرائیلی حد بندی کی خلاف ورزی کرنے پر ایک یہودی فوجی نے اس کے پیٹ میں گولی ماری تھی۔ کٹا ہوا پیٹ سالوں تک اس کے لیے باعث پریشانی و اضطراب بنا رہا۔ امریکہ منتقلی کے بعد بھی اس نشان کا احساس اسے بدستور رہتا تھا۔ ایک جگہ خود کلامی کرتی ہے ”بستر میں لیٹے لیٹے میں نے اپنے بد صورت پیٹ پر ہاتھ پھیرا، جیسے میں اپنے ماضی سے رشتہ جوڑ رہی ہوں۔“^۹ ایسے ہی ۱۹۶۷ء کی جنگ کے دنوں میں جب ہدی اور امل کئی روز تک زیر زمین گڑھے میں پناہ لیے ہوئے تھے اور اماں اپنے حواس کھو بیٹھی تھی تو امدادی کاروائیوں کے دوران جب اس کا سامنا اماں سے ہوا تو امل نے چاہا کہ وہ ان سے لپٹ جائے مگر ضالیہ صدمے سے حواس کھو چکی تھی تکلیف اور غصے کے باعث امل نے بھی انہیں پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ لڑکپن میں روح پر لگا زخم تمام زندگی اس کے لیے ناسور بنا رہا سالوں بعد ڈیوڈ سے اس بات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتی ہے

۱۹۶۷ء کے اس دن ان کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی تھی۔ جب ہمارے باورچی خانے میں دھماکہ ہوا تھا۔ وہ سمجھی تھیں کہ اس دھماکے میں میں بھی ختم ہو گئی۔۔۔ میرا خیال ہے ان کے لیے یہ ایک ہولناک صدمہ تھا۔ اس کے بعد ساہا سال ایک احساس جرم کے ساتھ میں یہی سوچتی رہی کہ میں انہیں صدمے سے نکال سکتی تھی۔ اگر میں خیمے والے ہسپتال میں انہیں ان کے دماغ کے بھوت پریتوں کے ساتھ اکیلا چھوڑ کر سسٹر میریان کے ساتھ بیت اللہ نہ چلی جاتی تو انہیں اس صدمے سے بچا سکتی تھی۔^{۱۰}

ایسے بہت سے زخم ہر کردار اپنی روح اور جسم پر لیے آگے بڑھتا ہے۔ کچھ کردار خود کو ان زخموں کی آسیب زدگی سے آزاد کروا پاتے ہیں جب کہ کچھ کردار عملی زندگی کو آگے بڑھانے میں ناکام رہتے ہیں۔ جیسے امل کے چچا درویش، دادا بیگی، وغیرہ

اردو میں تاریخی ناولوں کی روایت کا آغاز عبد الحلیم شرر سے ہوتا ہے۔ حکیم محمد علی خاں طبیب، حکیم محمد سراج الحق، راشد الخیری مولانا صدق حسین، نسیم حجازی، قرۃ العین حیدر، عبد اللہ حسین، احسن فاروقی، قاری عبدالستار نے تاریخی ناول نگاری کی روایت میں اپنا حصہ ڈالا۔^{۱۱} تاریخی ناول سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ اس مخصوص عہد کی ایسی جیتی جاگتی تصویریں تخلیق کرے کہ وہ عہد اپنی آب و تاب کے ساتھ قارئین کے سامنے آجائے۔ اس توقع کی تکمیل کے لیے ناول نگار کو تاریخ سے واقفیت ہونا ضروری ہے نیز اس کا تخیل مضبوط ہونا چاہیے اور اگر ناول نگار اس ماحول سے کسی بھی قسم کا تعلق رکھتا ہو تو تصویر میں حقیقت کے رنگ بھرنے کی قدرت بھی حاصل ہو جائے گی۔^{۱۲} اس ناول میں یہ تینوں شرائط پوری ہوتی ہیں۔ ناول نگار تاریخی حقائق سے واقف بھی ہے۔ مزید یہ کہ اس حوالے ان کی گئی تحقیق کے واضح آثار بھی نظر آتے ہیں۔ ناول میں جاہاجر نلسٹ اور اہم شخصیات کے حقیقی واقعات پر تبصرے شامل کے گئے ہیں۔ ناول میں تاریخی واقعات کی سنہ وار ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ تاریخی واقعات کو سیاسی حکمت عملیوں اور سماجی تباہی سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ ناول میں دو بڑی جنگوں اور تاریخ کے تین اہم قتل عام کے واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۷ء کی جنگیں، ۱۹۸۲ء میں لبنان میں ہونے والی قتل و غارت، ۱۹۸۳ء میں بیروت

میں امریکی سفارت خانے پر ہونے والا حملہ اور ۲۰۰۲ء میں جنین کے پناہ گزینوں پر کیے جانے والے حملے کے واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ ناول کے واقعات اور مصنفہ کی زندگی کے حالات کا موازنہ کریں تو اس امر کا اندازہ بھی ہوتا ہے مرکزی کردار امل اور مصنفہ میں مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ یروشلم اور پھر امریکہ سے تعلیم ہی نہیں بلکہ امل کا ناول کے اختتام میں بیٹی کے ساتھ فلسطین آنا بھی ناول نگار کی زندگی کے واقعات کے عین مطابق ہے۔ یوں فلسطین سے ناول نگار کے براہ راست تعلق اور ان کے مضبوط تخیل نے اسے ایک بہترین ناول بنا دیا ہے۔

اس تاریخی ناول کو مختلف انسانی جذبات سے بُنا گیا ہے۔ حب الوطنی، محبت اور دوستی جیسے خوب صورت جذبات سے کہانی کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ محبت کی داستان حسن اور ضالیہ کے کرداروں سے شروع ہوتی ہے۔ پھر یہ جذبہ یوسف اور فاطمہ کو ایک بندھن میں باندھتا ہے، امل اور ماجد کو دور ابتلا میں مسرت بہم پہنچاتا ہے تو کبھی اسامہ اور ہدی کی تکلیفوں سے پر زندگی میں چاہت کے رنگ بکھیرتا ہے۔ حسن اور ضالیہ عین ہود کی پر مسرت اور آزاد فضا میں محبت کا بندھن باندھتے ہیں مگر ہر مشکل میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ یوسف اور فاطمہ کی محبت مشکل ترین دنوں میں پروان چڑھتی ہے۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے اثرات کا سامنا بھی کرتی ہے اور یوسف فکری تبدیلیوں سے گزر کر فدائی بن جاتا ہے مگر محبت کا تعلق زمینی فاصلوں کے باوجود انھیں جوڑے رکھتا ہے اور پھر وہ دونوں بیروت میں اپنے خوابوں کی جنت بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے زندگی کی بازی ہار بیٹھتے ہیں۔ امل جنین سے یروشلم اور پھر امریکہ تک محبت کی تلاش کرتی ہے اور پھر ماجد کی صورت میں بیروت میں اس کی تلاش مکمل ہو جاتی ہے۔ محبت یہاں ان دونوں کی ذات کی تکمیل کرتی ہے مگر بیروت کے مخدوش حالات اور کسی پر امن خطہ ارضی میں سکونت کی خواہش ان کی جدائی کا باعث بنتے ہیں۔ اسامہ اور ہدی جنین کے کیمپوں میں محبت کا تعلق بناتے ہیں، رشتہ ازدواج میں منسلک ہوتے ہیں اور پھر ان ہی کیمپوں میں اپنے چار بچوں کے ساتھ اسرائیل کی بربریت کا سامنا کرتے ہیں۔

ناول کی کہانی دوستی کے پر خلوص جذبے میں گوندھی نظر آتی ہے۔ طویل آزمائشوں کے باوجود عین ہود کے باسی بیچی اور حاجی سالم کی دوستی جنین کے کیمپوں میں موجود پناہ گزینوں کی لیے بمثل سائبان نظر آتی ہے۔ بیچی کی شہادت کے سالوں بعد بھی حاجی سالم کی بیچی کی نسل کے لیے پر خلوص محبت بدستور قائم رہتی ہے۔ یہی پائیداری حسن اور آری پرل شائین کی دوستی میں بھی نظر آتی ہے۔ حسن فلسطینی جب کہ آری پرل شائین یہودی ہے مگر یہ دونوں بچپن میں ہی اس بندھن میں بندھے اور پھر ہر مشکل وقت میں ایک دوسرے کا ساتھ نبھایا۔ حسن نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے آری کی حفاظت کی اور آری نے بھی ایسا ہی کیا۔ امل اور ہدی جنین کے کیمپوں میں کھیلنے اور ۱۹۶۷ء کی جنگ کی تباہ کاریوں کا سامنا کرتے ہوئے دوستی کے تعلق کو مضبوط کرتی ہے۔ ناول میں دوستی کے لازوال جذبے کی ایک اور خصوصیت کا اظہار کیا گیا ہے جو ناول کے تمام دوستوں کے ہاں مشترک نظر آتی ہے۔ مخلص دوستوں کی وفاداریاں فقط دوستوں تک محدود نہیں رہتی بلکہ سچی دوستی کا اخلاص نسلوں تک جاتا ہے۔ حاجی سالم بیچی کے گزر جانے کے بعد اس کی نسل کے لیے سائبان کی مانند دکھائی دیتا ہے۔ آری پرل شائین حسن کے بعد اس کی بیٹی امل پر ناول کے آخر میں محبت نبھا کر تادکھائی دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح امل کی شہادت کے بعد اس کی بیٹی سارہ امریکہ واپس جا کر ہدی کے جنگ سے متاثر بیٹے منصور کو امریکہ بلا کر نئی زندگی دیتی ہے۔

ناول میں جہاں محبت اور دوستی کا لازوال جذبہ تو پیش کیا گیا ہے وہی فلسطین کی لہورنگ تاریخ کے سائے ان جذبوں کے گلے گھونٹتے دکھائے گئے ہیں۔ سب ہی محبت کی داستانوں کا اختتام اور دوستوں کی جدائی کا باعث فلسطین پر اسرائیل کے غاصبانہ قبضے کو دکھایا گیا ہے۔ حسن ۱۹۶۷ء میں لاپتہ جب کہ ضالیہ حواس کھو بیٹھتی ہے۔ فاطمہ بیروت پر حملے میں اپنی بیٹی سمیت شہید ہو جاتی ہے اور یوسف انتقام میں امریکی سفارت

فلسطین کے تناظر میں ناول *the Scar of David* کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

خانے پر خود کش حملہ کر دیتا ہے۔ ماجد حالات کے خوف سے اہل کو امریکہ واپس بھیج دیتا ہے اور بیروت میں شہید ہو جاتا ہے۔ یحییٰ، حسن، اہل سب اسرائیل کے ظلم کا شکار ہو کر دوستوں سے جدا ہوتے ہیں۔ مصنفہ نے یوں ناول میں فلسطین پر مسلط ہونے والی تباہی سے افراد کی خانگی اور نجی زندگیوں کو تباہ ہوتے دکھایا ہے۔

حب الوطنی کے جذبے سے تو سبھی فلسطینی سرشار نظر آتے ہیں۔ یہ جذبہ کسی کو فدائی بنا دیتا ہے تو کسی میں علم کے حصول کی تڑپ جگا دیتا ہے۔ حب الوطنی ہی وہ جذبہ جس کے باعث ۱۹۴۸ء سے اب تک فلسطین کی نسلیں لڑ رہی ہیں۔ زمین اور وطن کی محبت ان میں لڑنے اور کٹ مرنے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ ناول میں جہاں ایک طرف امید، ہمت حوصلہ مندی کے جذبوں کی عملی پیشکش نظر آتی ہے تو دوسری جانب عدم شناخت کا المیہ ہے۔ نفرت اور انتقام کا جذبہ ہے جو حریت کے متوالوں کو دہشت گرد بنا دیتا ہے۔

ناول کی کہانی سے آج کے فلسطینیوں کے بلند حوصلے اور جرات کار از بھی متکشف ہوتا ہے۔ موجودہ فلسطینی نسل نے آنکھ گولے بادور کی بو میں کھولی ہے۔ اس لیے یہ فضا اب انھیں خوفزدہ نہیں کرتی۔ یہاں کے بچوں کے تجربات عام بچوں کے تجربات سے مختلف ہوتے ہیں۔ کھیل کود کی بجائے جنازے اور مقابلے ان کے حافظے کا حصہ بنتے ہیں۔ بچپن کی عمر عقلی منطق کی بجائے جذباتیت کی ہوتی ہے۔ یہودی بربریت کے خلاف اپنے احتجاج کا اظہار ان کے ٹینکوں پر پتھر برسا کر کرنے سے ان کے اعتماد میں اضافہ ہوا بالکل ویسے ہی جیسے جنگی مشقیں سپاہیوں کے اعتماد کو بحال کرتی ہیں اور جنگ کے لیے تیار کرتی ہیں۔ پھٹرنے کے دکھ سے آشنا ہو چکی یہ نسل زندگی کے چھن جانے کی حقیقت کو تسلیم کر چکی ہے۔ اس لیے لمحہ موجود کو آزادی کی کوشش میں گزار دینے کی خواہاں ہے۔ نیز یہودیوں کے مقابلے میں فلسطینیوں کی چھوٹی چھوٹی کامیابیاں ان کے جذبہ حریت کو جلا بخشتی ہیں۔ یوسف سمیت ناول کے کئی کردار اپنی زندگی کی حقیقت سے آگاہ دکھائے گئے ہیں۔ یوسف جو پہلی جنگ کی تباہی کا ایک چار سالہ ڈرا سہا شاہد تھا ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد ایک جگہ کہتا ہے کہ "مجھے تو ایک غصہ شدہ زندگی ورثے میں ملی تھی" ۱۳

کیمپ میں موجود دیگر پناہ گزین نسل کی فکر کا اظہار کچھ یوں کیا ہے۔

انھوں نے شہادت کا جشن منانا سیکھا۔۔۔ یہ سیکھا کہ صرف شہادت ہی آزادی دلا سکتی ہے۔ صرف ان کی موت ہی اسرائیل کو کمزور کر سکتی ہے۔ اس نسل کو جو کیمپوں میں پیدا ہوئی صدموں کی شدت نے مرنے والوں کی محبت سے تسکین حاصل کرنے کی بیماری میں مبتلا کر دیا۔ موت زندگی بن گئی اور زندگی موت۔ ۱۴

ناول میں مصنفہ نے فلسطینی بچوں کی نفسیات پر جنگ کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے ۱۹۴۸ء سے پہلے کے فلسطینیوں اور بعد کے مخدوش حالات میں پرورش پانے والی نسل کے متضاد رویوں کو پیش کیا ہے۔ آغاز میں پیش کیے گئے کردار پر اعتماد، آزاد اور تخلیقی صلاحیتوں کے حامل نظر آتے ہیں۔ یحییٰ اور حاجی سالم جسمانی طاقت کے ساتھ ذہنی صلاحیتوں کے مالک ہیں، درویش گھڑ سواری کا شوقین ہے، اظہار کی قوت کا حامل ہے۔ یوسف مطالعے کا شوق رکھتا ہے، ضالیہ بدو لڑکی آزاد منش ہے جسے کوئی پابہ زنجیر نہیں کر سکتا۔ وہ ہوا کے دوش پر اڑتی ہے۔ سماج کی کسی پابندی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کے برعکس پناہ گزین کیمپوں میں پلے بڑھے بچوں میں قوت اظہار نہیں ہے، ان میں اعتماد نہیں ہے۔ دل میں شکایت ہے مگر زبان سے کہنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو بیان کرنے سے خوفزدہ ہے۔ ہدی اپنے ساتھ ہونے والی جنسی زیادتی کا ذکر کسی سے نہیں کر پاتی، اہل والدین کی توجہ حاصل کرنے کی خواہاں رہتی ہے مگر اس کا تقاضا کرنے کی جرات نہیں رکھتی ہے۔ منصور اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کو بیان کرنے کی سکت نہیں رکھتا اس لیے بولنا ہی ترک کر دیتا ہے۔ یہاں پرورش پانے

والے بچے دل میں خواہشات تو رکھتے ہیں مگر ان کے اظہار کے فن سے نا آشنا ہے۔ یہ درپہ صدمات، اپنوں کے چھڑنے، انہیں اذیت سہتے دیکھنے اور سب سے بڑھ کر نظر انداز کیے گئے ماحول میں پرورش پانے سے ان کی بنیادی صلاحیتوں کی نشوونما نہیں ہو پاتی۔ فطری امر ہے زندگیاں کھونے کے دکھ، بے گھری کی حالت میں رہتے لوگوں کی توجہ اولاد کی طرف ہو ہی نہیں سکتی۔

ناول میں مغربی استعماری فکر کا اظہار بھی ہے اور عرب ممالک کی فلسطین تنازعے کے حوالے بے حس خاموشی کی پیش کش بھی ہے۔ کسی طرح حریت کے نام پر قائم ہونے والی تنظیموں کے سرغنہ نے اپنے مجاہدین کے ساتھ دھوکے کیے۔ الغرض ناول میں اس مسئلے کے تمام سیاسی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ فلسطین کے تنازعے کے حل ہونے میں حائل روکاؤں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اہل فلسطین تو ہمیشہ جان و مال کی قربانیاں دینے کے لیے تیار رہے مگر مخلص قیادت کی عدم دستیابی، عرب ممالک کی خاموشی، مغربی ممالک کی سازشوں نے حریت کے متوالوں کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر نہیں ہونے دیا۔ نیز ناول میں فلسطین کے معاملے میڈیا کے کردار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ اسرائیل کی حتی الامکان یہ کوشش رہی ہے کہ وہ اصل حقائق کو میڈیا سے چھپائے۔ صحافیوں کو حساس علاقوں تک رسائی ہی نہیں دی گئی اور جہاں تک صحافیوں کی رسائی تھی وہاں انہیں سچ لکھنے کی اجازت نہ تھی۔ فقط چند ہی صحافی ایسے تھے جنہوں نے جان کی پرواہ کیے بغیر سچ کا ساتھ دیا مگر عموماً مغرب نے میڈیا کو اپنے من چاہے نقطہ نظر کی پیش کش کے لیے استعمال کیا۔ جیسے کہ ۲۰۰۲ء میں دہشت گردوں کے صفائے کے نام پر جنین کے پناہ گزینوں کا قتل عام کیا گیا۔ اسی طرح فلسطین کی سرزمین کو اپنے آباء کی زمین ثابت کرنے کے لیے بھی میڈیا کا سہارا لیا گیا۔ جن صحافیوں نے ان مظالم کی سچی تصویر کشی کی وہ حساس دلوں کے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھی۔

۲۴ فروری ۱۹۹۲ء کے ایک اسرائیلی اخبار Hadashot کا ایک حصہ نقل کیا ہے۔

وہاں جو ہو رہا ہے۔۔۔ اسے ہولناک اور ہیبت ناک ہی کہا جاسکتا ہے۔ وہ قیدیوں کو مار مار کر ان کے جسم پر ڈنڈے توڑ دیتے ہیں۔ ان کے حساس اعضاء پر ڈنڈے برسائے جاتے ہیں۔ انہیں فٹ بال کی طرح باندھ کر ٹھنڈے فرش پر ڈال دیا جاتا ہے اور ان سے فٹ بال کھیلی جاتی ہے۔ ان کو تھو کریں ماری جاتی ہے اور فٹ بال کی طرح انہیں لڑھکایا جاتا ہے۔ بھر انہیں بجلی کے جھٹکے دئے جاتے ہیں۔ اس کے لیے فیلڈ ٹیلی فون کا جزیئر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد انہیں گھنٹوں باہر بارش میں کھڑا رکھا جاتا ہے۔۔۔ وہ قیدیوں کی عزت نفس کچل دیتے ہیں۔ آخر میں وہ گوشت کا لو تھڑا ہی رہ جاتے ہیں۔^{۱۵}

مصنفہ نے ناول میں فلسطین کی لہورنگ تاریخ قلم بند کرنے اور ان کے ساتھ دہائیوں سے روا ہونے والی زیادتیوں کے بیان کے ساتھ انسانیت کے فلسفے کو بھی پیش کیا ہے۔ ناول کے مرکزی کردار اہل اور اس کی بیٹی سارہ کے ذریعے تمام انسانوں کے دکھ کو بلا تفریق رنگ و مذہب پیش کیا ہے۔ اہل نے جیسے فلسطین کے غم کو محسوس کیا اسی کرب کے ساتھ لبنان میں امریکی سفارت خانے پر کیے گئے حملے میں مرنے والوں کے متعلق بھی سوچا، لبنان پر کی گئی بمباری سے گرنے والی عمارت میں ماجد شہید ہوا تھا۔ ۱۱ ستمبر کو امریکہ میں ہونے والے فضائی حملے نے اس کے بیوگی کے زخم کو ہرا کر دیا۔ ایک فلسطینی کی حیثیت سے اس کے خاندان نے ان گنت دکھ اٹھائے یہاں تک کہ ترک وطن کی راہ اختیار کرنا پڑی مگر اس کے باوجود انسانیت کا جذبہ دھندلایا نہیں۔ رنگ و نسل کی تمیز سے بالاتر ہر کراس نے ہر انسان کے دکھ کو محسوس کیا۔ اہل کے بعد اس کی بیٹی سارہ ناول میں انسانیت کے پیغام کا تسلسل ہے جو جیکب کے لیے دوستی اور منصور کے لیے اپنے گھر کے دروازے کھولتی ہے۔ ناول کے اختتام پر سارہ، ڈیوڈ کا یہودی بیٹا جیکب اور ہدی کا بیٹا منصور (یعنی ایک امریکی، ایک یہودی اور ایک فلسطینی) امریکہ میں ایک ساتھ خاندان کی مانند رہتے دکھائے

فلسطین کے تناظر میں ناول *the Scar of David* کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

گئے ہیں۔ ناول نگار ایسے ہی معاشرے اور سوچ کی خواہاں ہے جہاں اپنی جگہ بنانے کے لیے کسی دوسرے کو بے دخل ناکرنا پڑے۔ ناول کے آغاز اور اختتام دونوں جگہ اس فلسفے کا اظہار ہے۔ آغاز میں حسن اور یہودی آری پرل شائین کی دوستی اسی فکر کا پرچار کرتی ہے۔ ناول کے اختتام تک بوڑھا آری حسن کی دوستی کی یاد کے حصار میں نظر آتا ہے۔

فلسطین کے حساس موضوع کو نبھاتے ہوئے جہاں مصنفہ نے سیاسی و سماجی و تاریخی مسائل پر روشنی ڈالنے کی سعی کی ہے وہاں ان تمام حقائق کی پیش کش میں غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہودیوں کو اہل فلسطین پر ظلم کرتے دکھایا ہے تو تاریخ کے اس دور کی جھلکیوں کو بھی ناول کا حصہ بنایا ہے جہاں یہودیوں کو تختہ ستم بنایا گیا تھا۔ آری پرل شائین بچپن میں جسمانی تشدد کے نتیجے میں ساری زندگی لنگڑا کر چلتا ہے۔ آری کی ماں انتہائی مہذب اور خوب صورت ہونے کے باوجود زندگی کی حرارت سے محروم ہے۔ یولانتا اور موئے اپنا یہودی خاندان کھو چکے ہیں۔ ماضی میں سبے گئے ظلم کے نتیجے میں یولانتا کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ یہی دکھ موئے کو اسماعیل کو اغوا کرنے پر مائل کرتا ہے۔ موئے اپنی کمی کو پورا کرنے کے لیے ایک بچے کو ماں سے جدا تو کر دیتا ہے مگر مصنفہ نے اسے بے حس یہودی کی بجائے تمام عمر احساس جرم میں مبتلا دکھایا ہے۔ ضالیہ کی اپنی اپنی کی صدائیں ہر دن اس کا پیچھا کرتی ہے یہاں تک کہ مرنے سے پہلے وہ خود کو اس بوجھ سے آزاد کرنے کی خاطر ڈیوڈ کو ساری سچائی بتا دیتا ہے کہ وہ ضالیہ کا بیٹا اسماعیل ہے۔ اسی طرح ۱۹۶۷ء میں نن کو میڈیا کے سامنے زخمی بچوں کے ساتھ آنے پر روکنے والے یہودی کو بھی نن کی زبان سے یہی جواب دیا گیا ہے کہ فلاحی تنظیموں نے یہودیوں کی مدد کی تھی اور اب فلسطینیوں کی کر رہی ہے۔ اس سے انھیں کوئی نہیں روک سکتا۔ غرض یہ کہ مصنفہ نے اپنے قلم کو جانبداری کے جرم سے داغدار ہونے نہیں دیا۔ یہودیوں کے انسان دوست مخلص کردار بھی تخلیق کیے، یہودیوں کے ساتھ ہونے والے مظالم کو بھی قلم بند کیا اور فلسطین کے ساتھ دہائیوں سے روارکھے جانے والے ظلم کی داستان بھی پوری صداقت سے پیش کی۔

اردو میں فلسطین کے تاریخی سانحے پر کوئی خاطر خواہ ناول موجود نہیں ہے۔ مسعود اشعر نے اس تاریخی ناول کا ترجمہ کر کے اردو کے تاریخی ناولوں کے ذخیرے میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ ترجمہ ایک کٹھن عمل ہے اور جب بات ادبی ترجمے کی ہو تو یہ اور بھی مشکل تصور کیا جاتا ہے۔ مترجم پر مصنف سے دیانتداری نبھانے کی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے^{۱۶} مسعود اشعر کے اس ترجمے کی خصوصیت یہ بھی ہے انھوں نے مصنفہ سے دیانتداری کے فرض کو باخوبی نبھایا ہے۔ اس ترجمے میں مترجم کو فقط ماخذ زبان اور ہدفی زبان کے مسائل سے نبرد آزما نہیں ہونا تھا بلکہ یہاں دو اجنبی تہذیبوں کا آمناسامنا تھا۔ ادبی ترجمے کے خصوصی مسائل میں تہذیبی مسائل سر فہرست ہوتے ہیں۔^{۱۷} مترجم کو مختلف مقامات پر ماخذ تہذیب اور ہدفی تہذیب کا موازنہ کر کے ان میں کسی ایک کے اظہار کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ یہ خیال بھی سامنے رہتا ہے کہ کردار اپنی تہذیبی بوئاس کے ساتھ سامنے آسکے اور یہ اندیشہ بھی لاحق رہتا ہے کہ قارئین کے لیے یہ اتنے اجنبی نہ ہو جائیں کہ ان کے افعال و افکار ناقابل فہم بن جائے یا کردار کی مکمل تصویر ہی پیش نہ ہو سکے۔ زخم کا نشان کے مترجم نے یہ اعتدال باخوبی برقرار رکھا ہے ہر کردار پاکستانی تہذیب سے دور کھڑا نظر بھی آتا ہے مگر ابلاغ کا مسئلہ پیش نہیں آتا۔ تہذیبی فرق کے باوجود یہ کردار قاری کو اپنے قریب محسوس ہوتے ہیں۔ ماخذ تہذیب کو برقرار رکھنے کے لیے مترجم نے کرداروں کے ناموں میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی۔ مگر بہت سے ایسے مقامات بھی ہے جو وضاحت کے متقاضی ہیں۔ ہر ادب پارہ دیگر کئی ادب پاروں سے استفادے کے بعد وجود میں آتا ہے۔ یوں ایک متن میں بین المتنیت کی متنوع صورتوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ بین المتنیت کے مسئلے سے بٹنے کے لیے ماہرین ترجمہ نے مختلف حکمت عملیاں پیش کی ہیں جن میں ایک اہم حاشیہ تحریر کرنے کی بھی ہے۔^{۱۸} ناول میں اس کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ تہذیبی حوالوں کی وضاحت کے حوالے سے بھی یہ کمی برابر محسوس ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر ناول میں بنیادی متن کی پاسداری کرتے ہوئے مصنف کے فکر اور اسلوب کو بھرپور انداز میں منتقل کیا گیا ہے۔ جیسے کہ ضالیہ کا اسماعیل کے کھوجانے پر

ابنی اپنی پکارنا۔^۹ اسی طرح اور بھی کئی مقامات پر عربی الفاظ کا ویسے ہی استعمال کیا گیا ہے جیسے مصنفہ نے انگریزی متن میں کیا ہے ان چند الفاظ سے پورے کردار اپنی مخصوص کیفیات سمیت خلق ہوئے ہیں۔

قصہ گوئی، تنظیم و تسلسل، زبان و بیان اور زندگی کی تصویر ناول کی بنیادی شرائط ہیں۔^{۱۰} سوزن ابوالہوا کے ناول میں یہ تمام شرائط پوری ہوتی ہے۔ افراد کی نجی زندگی کی کہانیوں سے قوم کے قصے تک، تاریخ وار ترتیب سے واقعات کا بیان کیا گیا ہے۔ مربوط پلاٹ ناول کی اہم خصوصیت تصور کیا جاتا ہے۔ اس ناول کا کینوس بہت وسیع ہونے کے باوجود مصنفہ نے اسے بہت خوبی سے سنبھالا ایک نسل کے دکھ دوسری نسل کو سمیٹتے دکھایا ہے۔ فلسطینیوں کی آزمائشوں اور قربانیوں کو نئی نسل کا ورثہ بنا کر پیش کیا ہے۔ فلسطینی تاریخ کے اس مقام پر ہے جہاں اگلی نسل کو دینے کے لیے نہ املاک نہ زمین فقط جذبہ حب الوطنی اور آزادی کی امید ہے جو شہدائے ترکے سے ورثہ کو مل رہی ہے۔ فلسطین اسرائیل تنازعے کے حل کے حوالے سے عرب سمیت دیگر ممالک کے عملاً کھوکھلے کردار پر بھی تنقید کی گئی ہے۔ ناول میں سیاسی و تاریخی واقعات کو افراد کی زندگیوں سے یوں وابستہ کر کے پیش کیا گیا ہے کہ انسانی زندگی کے سبھی جذبوں کے رنگ اور ذائقے محسوس ہو جاتے ہیں۔

حوالہ جات

^۱ بتاریخ ۲۳ دسمبر ۲۰۲۳ء، 165673902/ authors/ Susan-Abulhawa/ www.simonandschuster.com/

^۲ بتاریخ ۱۴ جنوری ۲۰۲۴ء، https://playgroundsforpalestine.org

^۳ بتاریخ ۲۰ نومبر ۲۰۲۳ء، 06/ jun/ 2015/ building-playgrounds-in-2023/ www.theguardian.com/ lifeandstyle/

palestine-this-is-their-special-place-and-refuge

^۴ سوزن ابوالہوا، Morning in Jenin (امریکہ: بلومبرگ پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)

^۵ سوزن ابوالہوا، The scar of David (مترجم: (کراچی: شہر زاد، ۲۰۱۰ء) https://youtu.be/IFO1KnyBKV0?si=YePbAv52Qjdd-2ZP

^۶ بتاریخ ۱۴ جنوری ۲۰۲۴ء، 66920412024/ book/ show/ www.goodreads.com/ en/

^۷ سوزن ابوالہوا، زخم کا نشان مسعود اشعر (مترجم: (کراچی: شہر زاد، ۲۰۱۰ء)، ص ۱۷۴۔

^۸ ایضاً، ۱۲۴۔

^۹ ایضاً، ۲۳۲۔

^{۱۰} ایضاً، ۱۷۲۔

^{۱۱} سہیل بخاری، اردو ناول نگاری (نئی دہلی: الحمر پبلشرز، ۱۹۷۲ء)

^{۱۲} محمد شاکر، آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد: اردو میں تاریخی ناول نگاری (نئی دہلی: لبرٹی آرٹ پریس، ۲۰۰۳ء) ص ۳۱۔

^{۱۳} سوزن ابوالہوا، زخم کا نشان مسعود اشعر (مترجم) ص ۲۲۴۔

^{۱۴} سوزن ابوالہوا، زخم کا نشان مسعود اشعر (مترجم) ص ۱۵۳۔

^{۱۵} سوزن ابوالہوا، زخم کا نشان مسعود اشعر (مترجم) ص ۳۲۳۔

^{۱۶} مرزا حامد بیگ ”ترجمے کی ضرورت“ مشمولہ فن ترجمہ نگاری مرتبہ خلیق انجم (نئی دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۶ء)، ص ۲۶۔

^۷افخرہ نورین، ادبی ترجمہ تکنیک جہات اور امکانات (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹) ص ۱۱۲۔

^۸افخرہ نورین، ترجمہ کاری (اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اردو، ۲۰۱۴ء) ص ۱۰۰، ۹۹۔

^۹سوزن ابولہواز خم کا نشان مسعود اشعر (مترجم) ص ۵۰۔

^{۲۰}محمد شاکر، آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد: اردو میں تاریخی ناول نگاری، ص ۲۶۔